ہندوستان کے عرب ادباء کے درمیان کوئی مقام نہ پا سکے، حالانکہ ان کے مقامات حریری سے بہت بہتر ہیں، رسائل میں نیا پن ہے اور اشعار میٹھے ہیں۔ اس کی کوئی شرح نہیں لکھی گئی، صرف ایک شرح کا ذکر سید عبدالحی حسنی نے الثقافة الاسلامية میں کیا ہے، جس کا نام الیاقوت الرماني بشرح مقامات الهمداني بتایا ہے۔ یہ صرف اس لیے کہ ہمدانی کی کتاب کورس میں داخل نہ تھی۔

ہندوستانی عربی ادب مدارس کے اردگرد پروان چڑھا ہے، اس لیے وہ ادباء، جو خالص اصنافِ ادب پر قلم اٹھاتے ہیں، وہ بھی اپنے مقدموں میں اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ یہ دین کی خدمت ہے، یا کتاب کے موضوع کو کسی نہ کسی طرح دین سے جوڑتے ہیں، مثال کے طور پر صدیق حسن خان القنوجیؒ (م ۱۳۰۷ھ) اپنی کتاب "نشوة السكران من صهباء تذكار الغزلان" کے مقدمے میں رقم طراز ہیں:

''ہم تعریف بیان کرتے ہیں اس کی جس نے صبیح چہروں کو نرگسی آنکھیں اور گلابی رخسار عطا کیے اور مناسب قدوں کی ٹہنیوں پر انار اگا دیے اور ایک ایسے شخص کی تعریف کرتے ہیں جو خود کو خواہشاتِ نفس وہوئ سے دور رکھتا ہے اور اپنے محبوب کی تشبیب کرتا ہے اور صلاۃ وسلام ہو حضور ﷺ اور اصحاب کرام پر..... اس کتاب میں عشق وعشاق اور معشوقات کا ذکر ہے'' [۱۱]

احمد رسول پوری کے دیوان کے مقدمے میں تحریر ہے: ''یہ بات کسی سے مخفی نہیں کہ علم عربی تمام اسلامی علوم میں افضل ہے اور مسلمان عرصۂ دراز سے کوشش کر رہے ہیں کہ عربی زبان کو عام کریں، اور کیوں نہ ہو کہ اسلام اور عربی زبان کے درمیان ایسا تعلق ہے جس سے علم دین وشریعت کا چاہنے والا بے نیاز نہیں رہ سکتا [۱۲]

تیسری خصوصیت

اس ادب کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ شاہی ادب ہے جو بادشاہوں کے دربار میں پروان چڑھا ہے، اس لیے وہ عام لوگوں سے کٹا ہوا ہے۔ سلطان کی تعریف اس لیے کی جاتی ہے کہ وہ نوازتا ہے۔ جب وہ یا اس کا کوئی عزیز مرتا ہے تو

مرثیہ کہا جاتا ہے۔ رہے غرباء، فقراء، مساکین اور سوسائٹی کے عام لوگ تو ان کا اس ادب میں کوئی تذکرہ نہیں [۱۳]

ادبی تحریک ہند کے مختلف شہروں میں سلاطین اور ریاستوں کے حکمرانوں کے اردگرد گھومتی ہے۔ جب ملتان علم کا مرکز تھا تو وہاں بہت سے علماء پیدا ہوئے۔ پھر جب غزنویوں کے زمانہ میں لاہور پایۂ تخت بنا تو وہ مرکزِ علم وفن بن گیا۔ جب غوریوں نے دلی فتح کرلیا اور اس کو مفتوحہ ہندوستان کی راجدھانی بنایا تو وہ تیموری سلطنت کے خاتمہ تک علماء کا ملجا وماویٰ بنی رہی۔ گجرات، دکن، جون پور، لکھنؤ اور اودھ اور اس کے علاقے بلگرام، ہرکام، جائس، کاکوری، خیرآباد وغیرہ کا بھی یہی حال ہے۔ کوئی بھی سلطان مخالفانہ بات یا تنقید سننے کا روادار نہیں تھا، سلطان کی خواہشات و تصرّفات، جو دینِ اسلام کے سراسر خلاف تھیں، اگر علماء ان پر تنقید کرتے تو ان کی بے عزتی ہوتی اور اہمیت گھٹ جاتی اور جو مخالفت نہ کرتے وہ عیش وآرام سے رہتے۔ ہندوستان کے اکثر بادشاہوں اور نوابوں کی سیاست و اعمال میں دین کو بہت کم اہمیت حاصل تھی، بلکہ وہ اکثر معاملات میں شریعت کی مخالفت کرتے تھے۔

شیخ احمد سرہندیؒ کے رسائل، جو انھوں نے اپنے متبعین کو لکھے، وہ سوسائٹی اور ان لوگوں کی سیاست کی پول کھول دیتے ہیں جو دین کے نام سے حکومت کرتے تھے۔ وہ اپنے ایک خط میں تحریر کرتے ہیں: ''افسوس وحسرت، ہائے مصیبت، محمد ﷺ جو خدا کے محبوب تھے، ان کے متبعین اس ملک میں اجنبی بن گئے ہیں، انھیں بے عزت کیا جاتا ہے، آپؐ کے دشمنوں کی عزت ہے، باطل ظاہر وغالب ہے، حق بے عزت اور مستور ہے'' دوسرے خط میں تحریر فرماتے ہیں: ''مسلمانوں پر اس ملک میں ایسا وقت آیا ہے کہ اگر کوئی مسلمان شریعت پر عمل کرے تو اس کو جیل کی سزا ہوتی ہے اور اس کی بے عزتی کی جاتی ہے، دوسرے تمام مذاہب آزاد ہیں، دشمن مسلمانوں کی شماتت کرتے ہیں اور مذاق اڑاتے ہیں''۔ [۱۴]

ان تمام واقعات نے علماء و ادباء کے دلوں کو نہیں گرمایا۔ ہم ان تمام حادثات وواقعات کے لیے اس عہد کے ادب میں، نہ نثر میں نہ شعر میں، ایک حرف

نہیں پاتے ہیں، اس لیے کہ یہ سلطانی ادب ہے۔ سلطان جانتا ہے کہ ادباء کو کیسے خوش کیا جاتا ہے۔ شاہ جہاں نے ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کو دوبار چاندی میں تولا، اور قاضی محمد اسلم الھروی کو ایک بار سونے میں تولا۔ سلاطین کے دربار کے علماء و ادباء کے ساتھ یہی طریقہ جاری رہا۔ ایک طرف یہ سونا اور چاندی علماء کو عطا کیا جاتا تھا، دوسری طرف اسی شاہ جہانی دور میں ملک میں زبردست قحط پڑا، لوگوں نے علماء کے فتوے سے اپنے بچوں کو ذبح کر کے کھایا۔ ۱۵ اسی شاہ جہاں کے دور میں پرتگالی ہندوستان میں داخل ہوئے۔ ان کے تاجروں نے ملک پر قبضہ کرلیا اور عیسائی مشنریوں کا خطرہ بڑھ گیا۔ ۱۶ اس طرح کے اہم اور افسوس ناک واقعات نے ادباء کے احساس کو نہیں چھیڑا۔ ان کا ادب دربار کا قیدی بنا رہا۔ دربار سے باہر اس کو کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا، اور اگر کچھ نظر آ جاتا تو اس پر کوئی ردِّ عمل نہیں ہوتا تھا۔

اس کے مقابلہ میں دوسری طرف مشائخِ تصوف اور اہلِ عرفان صوفیا تھے، جنہوں نے ہر عہدِ حکومت میں اپنی علاحدہ حکومت قائم کر رکھی تھی۔ لیکن سلاطین نے ان کے ساتھ دوسرا سلوک کیا۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے بیان کیا ہے کہ:

''سید آدم بنوریؒ مدفونِ بقیع کے دسترخوان پر ایک ہزار آدمی روز کھانا کھاتے تھے، ان کی معیت میں ہزاروں لوگ اور سینکڑوں علماء چلتے تھے، جب سید ۱۰۵۳ھ میں لاہور میں داخل ہوئے تو ان کے ساتھ دس ہزار اشراف و مشائخ تھے، یہاں تک کہ شاہ جہاں خوفزدہ ہوا اور ان کو رقم بھیجی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر حج فرض کیا ہے، آپ حجاز چلے جائیں۔ وہ بادشاہ کا مقصد سمجھ گئے اور حرمین چلے گئے، جہاں ان کا انتقال ہوا۔'' ۱۷

ہندستان کے سلاطین نے جو کچھ مخالف علماء کے ساتھ برتاؤ کیا اس کا ایک دلچسپ خاکہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے اپنی کتاب ''ہندوستان کے سلاطین، علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر'' میں کھینچا ہے۔ یہ کتاب بہت دلچسپ ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہانِ ہند اپنے مخالف، پاک صاف فطرت والے، علم میں مشغول، سلاطین و حکام کے مددگار، نفع اٹھانے والے، حق بات ہمت کے ساتھ کہنے والے اور تنقید کرنے والے علماء کے ساتھ کس طرح کا برتاؤ کیا کرتے تھے۔ ۱۸

چوتھی خصوصیت

برصغیر کے ادب نے تہذیبی گہرائی کا عکس پیش نہیں کیا۔ ان کی سرزمین پر فارس کی وسیع تہذیب اور ہندوستان کی سرسبز تہذیب کا ملاپ ہوا تھا۔ ادباء کے لیے یہ بہت آسان تھا کہ فارس کے خیالات اور شعری ونثری متنوّع موضوعات سے استفادہ کرتے اور ہندوستانی آداب، اس کے وسیع خیالات اور منثور ومنظوم تخلیقات کے ساتھ اس کی پیوند کاری کرتے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو ہمارے لیے نہایت حسین و جمیل ادبی افکار ہیئت اور موضوع کے اعتبار سے پیش کر سکتے تھے۔ اس لیے کہ وہ بہت اچھی فارسی جانتے تھے، اس سے پوری طرح وابستہ تھے، اس کے جلو میں جیتے تھے اور اس زبان میں شعر کہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ داستان، ناول، نثر وشعر تہذیبی ادب سے بالکلیہ معدوم ہو گئے۔ ان کے لیے ممکن تھا کہ تاریخی روایات نظم کرنے میں مثنوی کے فن سے اور عشقیہ قصے لکھنے میں ہندوستان کے ماحول سے فائدہ اٹھاتے، جہاں اس طرح کے قصے بھرے پڑے ہیں، اور فارسی ادب میں بھی ان کا بہت رواج ہے۔ اسی طرح انھوں نے حیوانات کی زبانی قصوں کا فن، جو ہندوستانی اور فارسی ادب میں رائج ہے، اس کو مٹا دیا۔ ایک کتاب بھی کلیلة و دمنة کی طرح اس موضوع پر نہیں لکھی گئی۔ مولانا عبدالحی حسنی نے ایک کتاب کا ذکر کیا ہے، لیکن ان کا خیال ہے کہ وہ کتاب پائی نہیں جاتی۔ انہوں نے مؤلف کا نام تک نہیں لکھا، بلکہ تحریر فرمایا ہے کہ بعض بوہروں کے یہاں ایسے قصے پائے جاتے ہیں۔

پانچویں خصوصیت

برصغیر کے ادب کی پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں روایتی موضوعات پر شعر کہے جاتے ہیں، جیسے حضور ﷺ پر نعت، سلاطین وامراء اور دوست واحباب کی تعریف وتوصیف یا مرثیہ اور زہد وعرفان۔ یہ بنیادی موضوعات برصغیر کی عربی شاعری کی ریڑھ کی ہڈی ہیں۔ مگر بعض شعراء کے یہاں دیگر موضوعات بھی پائے

جاتے تھے، جیسے شیخ فیض الحسن سہارن پوری نے بیسویں صدی میں ایک شہر کی ہجو کی ہے۔انہوں نے ایک چور کے ان کے گھر میں داخل ہونے کے بارے میں اپنے احساسات درج کیے ہیں، انہوں نے اس واقعہ کا وصف بیان کیا ہے۔

موضوعات کے انتخاب میں روایت کی پابندی نے تجدید کے عمل کو معطل کر دیا ہے۔اشعار کی شکل میں تو اس سلسلہ میں شعراء نے کوششیں کی ہیں، جیسے محمد عباس تستری، جنہوں نے مثنوی سے استفادہ کیا ہے، یا آزاد بلگرامی، جنہوں نے فارسی اردو نظم کے ڈھانچہ یعنی غزل گوئی کو عربی میں داخل کرنے کی کوشش کی ہے، تاکہ اس کے ذریعہ عربی معنی ومفہوم کا احاطہ کر سکیں، مستزاد ترجیع بند ڈھانچہ، تخمسات اور مسدّسات کی طرح ہیں، جو کہ عربی کے دورِ انحطاط میں پیدا ہوئے، جیسے فارسی وزن پر رباعیات جس پر محمد افضل فقیر اور ڈاکٹر خورشید رضوی نے نظم کہی ہے۔ یہ دونوں جدید شاعر ہیں۔

لیکن ان لوگوں کی یہ کوششیں شہرت نہ پا سکیں، اس لیے کہ انہوں نے اردو یا فارسی کے خالص اوزان استعمال کیے، جنہیں عرب نہیں جانتے تھے۔کامیابی صرف ڈاکٹر رضوی کو ملی۔تجدید ادب کی فصل میں، مصنفِ کتاب نے ان کی تعریف کی ہے، مختصر یہ کہ برِ صغیر کے ادباء نے عربی ادب کے موضوعات میں تجدید کرنے کے بجائے ڈھانچوں، اوزان اور اشکال کی تجدید پر زور دیا۔

چھٹی خصوصیت

اس ادب کی چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک متعین تاریخی زمانہ سے متعلق ہے، جس میں مسلمانوں کو ہندوستان میں اقتدار حاصل تھا، لیکن جب ان کی کم زور حکومتیں بھی ختم ہوگئیں اور انگریزوں نے ملک پر قبضہ کرلیا تو عربی ادب انحطاط کا شکار ہوگیا، اور صرف دینی مدارس اور یونیورسٹیوں میں عربی کی تعلیم باقی رہ گئی جس کا کوئی خاص فائدہ نہیں۔زبان سیکھنے کا مقصد عرب ملکوں میں جا کر کام تلاش کرنا رہ گیا، وہاں کے ادب سے فائدہ اٹھانا اور نیا ادب تخلیق کرنا خواب وخیال کی باتیں ہو کر رہ گئیں۔اس لیے کہ انگریزی علم وفن اور تہذیب کی زبان قرار پائی، فارسی اور عربی

اوران سے مربوط زبانیں اوران کا ادب ختم کردیا گیا، مزید یہ کہ عربی تعلیم کے مراکز اوردینی مدارس کا منہج بہت کم زوراورفرسودہ ہےاورجیداساتذہ کا قحط ہے۔

ساتویں خصوصیت

اس ادب کی ساتویں خصوصیت یہ ہے کہ اس کی ترقی فطری انداز سے نہیں ہوئی۔ادب کا پیدا ہونا اور ترقی کرنا فطری انداز سے ہونا چاہیے۔پہلے اکھوا نکلے، پھرکم زور تنا وجود میں آئے ،پھر اس کی ٹہنی مضبوط ہو، پھر پھل آئے، پھر مرجھا جائے۔اس وجہ سے ہم برصغیر کے عربی ادب کے مختلف ادوار کی خصوصیات میں امتیاز نہیں کرسکتے، جیسا کہ کسی بھی ادب پر گفتگو کے وقت ہوتا ہے۔لفظی صنعت میں جو استغراق ابوالفضل بن مبارک کے یہاں ۱۰۰۴ھ میں پایا جاتا تھا، بالکل وہی چودھویں صدی ہجری میں محمد عباس تستری کے یہاں نظر آتا ہے اور ہو بہ ہو فضل حق خیرآبادی (م ۱۲۷۸ھ) کے یہاں تیرھویں صدی میں دکھائی دیتا ہے۔ابوالفضل بن المبارک ''سواطع الالہام'' کے بارے میں رقم طراز ہیں:

صراح لأصل الأصل طرس مطهر
سواء لكل الكل علس مطهم
إمام همام للكلام مؤول
صلاح سريد لسلام مسلم
مدار مراد للمدارك مطرح
ملاك كلام للمعلم معلم

مفتی محمد تستری کہتے ہیں:

لطفت لنا وأنزلت الكتابا
وتغفر إن يكن ذو الشرك تابا
هو المولىٰ ونحن له عباد
ومن سلكوا خلاف الشرع بادوا
يكرم بالعطايا من أتاه
ومن يجحد بنعمته فتاهوا

علامہ فضل حق خیر آبادی فرماتے ہیں:

فـؤادي هـائـم والـدمـع هـامـي
وسهـري دائـم والـجـفـن دامـي
وقـلـب مـافـتـى بـجـوى ودلـوع
ولـوع فـي اضـطـراب واضـطـرام

آپ ان مثالوں کو ملاحظہ فرمائیں۔صرف لفظی صنعت کا زور ہے۔اسی طرح ہم آسانی سے عبدالحکیم سیالکوٹی (م ۱۰۶۷ھ) الصغانی (م ۶۵۰ھ) یا عبدالرحیم صفی پوری (م ۱۲۷۶ھ) کے اسلوب کو عہدوں اور ادوار میں تقسیم نہیں کر سکتے۔[۱۶]

اس کا سبب مصنف کی نظر میں یہ ہے کہ برِصغیر کا ادب اپنی عظمت اور بلندی کے باوجود اجنبی ماحول میں بوئے گئے درخت کی طرح ہے۔اس لیے اس کی ترقی غیر فطری ہے۔اگر ہم کسی غیر مناسب جگہ درخت لگائیں تو ان میں سے دو چار درخت پھل دے دیں گے،لیکن اکثر سوکھ جائیں گے،یا ان کا تنا کم زور،ٹہنی بے کار یا پھل کڑوا ہوگا۔یہی معاملہ برصغیر کے عربی ادب کا ہے۔ادباء کی تخلیقات ہر ایک کی اپنی صلاحیت،مزاج اور ادبی احساس کی غماز ہیں،اساتذہ کا ماحول تعلیم سے جڑا ہوا ہے،اور عہدوں اور ادوار کا ان کی تخلیقات میں کوئی دخل نہیں ہے۔ڈاکٹر ظہور احمد اظہر کی رائے ہے کہ اس ادب کے انحطاط میں ان خصوصیات کا بڑا دخل ہے،اور ان کے علاوہ دیگر عوامل واسباب بھی ہیں۔اپنے مقالہ ''برصغیر میں عربی شاعری کے ابتدائی نقوش'' میں وہ ان اسباب کا یوں ذکر کرتے ہیں:

۱۔ ''عربوں کی سیاسی قوت ختم ہوگئی۔سندھ اور ملتان میں عربی حکومت نہ رہی۔سیاسی قوت پر زبان کا دارو مدار ہوتا ہے،اسی بنا پر سندھ میں دربار کی زبان عربی تھی اور تخاطب اور بازار کی بھی۔عباسی خلافت کے انحطاط وزوال کے سبب حکام اور والیوں نے بغداد کے خلیفہ سے قوت وطاقت کا حصول ختم کر دیا تھا،بلکہ حکومت اس کی تھی جو غالب آ گیا،جس نے قبضہ کرلیا۔یہ انتشار واضطراب مضبوط غزنوی حکومت سے پہلے ان علاقوں میں پورے زور شور سے جاری تھا جن سے مل کر اب پاکستان بنا ہے۔

۲۔ عرب حکومت کے خاتمہ اور قابض حکمرانوں کے بعد عرب خطے کی ادبی و ثقافتی سرگرمیوں سے برصغیر کا ناتا بالکلیہ ٹوٹ گیا، بلکہ ان حکمرانوں نے دونوں طرف کے لوگوں کے ملنے جلنے پر پابندی لگا دی اور براہ راست ثقافتی تعلق ایسا منقطع ہوا کہ آج تک بحال نہ ہوسکا۔

۳۔ عربی ادب کو جنوبی ایشیا میں پھیلنے سے پر تکلف اسلوب نے روکا، جو سجع، قافیہ اور اجنبی اور نامانوس کلمات سے لبریز تھا اور بدیع الزماں ہمدانی اور ابو القاسم الحریری اور ان کے متبعین کا تھا۔ یہ پر تکلف، بوجھل اور بانجھ اسلوب عربی اور اس کے مستقبل کے لیے، جو اکیلے پورے عالم اسلام کی زبان بننے کی صلاحیت رکھتی ہے، نہایت درجہ نقصان دہ تھا۔ اگر یہ ظلم عربی زبان کے ساتھ نہ کیا گیا ہوتا تو آسان، سہل اور شیریں فارسی نے کبھی عربی کی جگہ نہ لی ہوتی، اور اگر فارسی ایران اور اس کے پڑوسی علاقوں میں نہ اختیار کرلی گئی ہوتی تو عربی ہی تنہا اسلامی تہذیبی زبان ہوتی''

آخر میں ڈاکٹر احمد ادریس بڑی دل سوزی سے کہتے ہیں:

''برصغیر میں عربی کی خدمت کرنے والے خود اپنا راستہ بھول گئے، سوائے بانجھ اور پر تکلف اسلوب کے ان کے سامنے کچھ نہ تھا۔ وہ الفاظ سے کھیلنا اور اس کا تعویذ بنانا جان گئے تھے۔ بہت عرصہ تک اس سے کھیلتے رہے۔ جب ان کے بس میں یہ کھیل نہ رہا تو وہ حیرت زدہ ہوکر اس عدیم الفائدہ اسلوب کو دیکھتے رہے اور آج تک دیکھ رہے ہیں''۔

عربی زبان وادب پر برصغیر میں اس کے بعد سب سے خطرناک مرحلہ اس وقت آیا جب وہ تکلّف و تصنّع والی عربی لکھنے پر بھی قادر نہ رہے۔ اس وقت انہوں نے عربی کو سنسکرت، یونانی اور لاطینی جیسی مردہ زبانوں کی طرح پڑھانا شروع کردیا۔ عربی کے اساتذہ نے یہ کافی سمجھا کہ عربی متن طلبہ کے سامنے پڑھ کر اس کا ترجمہ مادری زبان میں کردیا جائے۔ آج بھی یہی حالت برقرار ہے۔ [۱۹]

البتہ ڈاکٹر احمد ادریس کی رائے یہ ہے کہ ہندوستان کی حالت اس سلسلہ میں پاکستان جیسی ہی ہے، لیکن پاکستان کے عرب ادباء بہتر پوزیشن میں ہیں۔ وہاں عربی سیکھنے سکھانے، مطالعہ کرنے اور اس میں تحریر کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔

حواشی ومراجع

۱۔ تاریخ الاسلام فی شبہ القارۃ الہندیۃ: ڈاکٹر احمد السادات، ۱۹۵۷ء۔

۲۔ ہندوستان میں عرب حکومتیں، قاضی اطہر مبارک پوری، کراچی، ۱۹۶۷ء ص:۲۲

۳۔ تاریخ الاسلام فی الہند ص:۷۶

۴۔ تمدنِ ہند پر اسلامی اثرات: ڈاکٹر تاراچند، اردو ترجمہ لاہور، ۱۹۶۴ء، ص:۵۹
انتشار العالم الاسلامی: ڈاکٹر عبداللہ طرازی، جدۃ ۱۹۸۵ء، ۱/۴۱

۵۔ تمدنِ اسلامی، ص:۷۹

۶۔ انتشار الاسلام فی العالم ۱/۴۶

۷۔ الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند، دمشق، ۱۹۸۳ء ص:۹

۸۔ حضارۃ الہند، عربی ترجمہ، ۱۹۴۸ء ص:۴۱۸

۹۔ سفینۃ البلاغۃ، الہند، ۱۳۱۱ھ، ص:۱۲-۱۳

۱۰۔ مجموعہ سخنہائے نخستین سمینار بیوستگیہائے فرہنگی ایران وشبہ قارۃ ج:۱، ص:۲۰۸

۱۱۔ نشوۃ السکران من صہباء تذکار الغزلان، الہند، ۱۲۹۴ھ، ص:۲

۱۲۔ دیوان احمد، الہند ۱۹۵۸ء، ص:۱

۱۳۔ المسلمون فی الہند، ص:۸۴، حرکۃ التالیف باللغۃ العربیۃ فی الاقلیم الشمالی الہندی، ڈاکٹر جمیل احمد، کراچی ص:۵۴

۱۴۔ الدعوۃ الاسلامیۃ فی الہند، الندوی، الہند ۱۳۷۸ء، ص:۱۶

۱۵۔ ہندوستان کے سلاطین، علماء، مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر: سید صباح الدین عبدالرحمٰن، الہند ۱۹۶۴ء، ص:۱۱-۳۴

۱۶۔ الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند، ص:۵۴

۱۷۔ المسلمون فی الہند، الندوی، ص:۱۰۶

۱۸۔ نزہۃ الخواطر، الہند ۱۹۷۶ء، ۵/۳۰

۱۹۔ مجلۃ المجمع العربی الباکستانی، لاہور، العدد الثانی، نومبر ۱۹۹۳ء، ص:۲۹-۳۰